اس وقت کام سے واپس آچکا تھا۔ جب حسین شاہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ میں اپنے دروازے میں کھڑا تھا۔ حسین شاہ میرے قریب سے گزرا تو مجھے شراب کی بو آئی۔ ابھی پب کے کھلنے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ حسین شاہ نے شاید دکان سے خرید کر چڑھالی تھی۔ میری کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر ارشاد، میری اور ثاقب بیٹھے تھے۔ حسین شاہ دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ ان تینوں نے حسین شاہ کی طرف دیکھا اور میری نے اسے "ہیلو" کہہ کر اپنی باتیں جاری رکھیں۔ حسین شاہ جواب دیے بغیر اسی طرح دروازے میں کھڑا رہا۔ اچانک کمرے میں ان تینوں کی باتیں رک گئیں۔ وہ سر اٹھا کر حسین شاہ کی منہ کی طرف دیکھنے لگے۔ ثاقب اور ارشاد کرسیوں پر بیٹھے تھے اور میری بستر پر کہنی رکھ کر لیٹی ہوئی تھی۔ انھوں نے حسین شاہ کے چہرے پر کیا دیکھا، یہ مجھے علم نہیں۔ حسین شاہ کی پشت میری طرف تھی۔ مگر اسے دیکھتے دیکھتے وہ ایک ایک کر کے اپنی جگہوں سے اٹھنے لگے۔ پہلے میری آہستہ آہستہ بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر ثاقب کرسی چھوڑ کر اٹھا۔ حسین شاہ کی نظریں ارشاد پر لگی تھیں۔ وہ دروازے سے چلا اور جا کر ارشاد کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ارشاد کے بال پکڑے اور اسے کھینچ کر کرسی سے اٹھا لیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے ایک پورے زور کا تمانچہ ارشاد کے منہ پر مارا۔ پھر الٹے ہاتھ کو وہ اسی زور سے گھما کر لایا اور ارشاد کے منہ پر دوسری طرف تمانچہ پڑا۔ جس سے ارشاد کا منہ چھت کی طرف اٹھ گیا۔ پھر حسین شاہ کا سیدھا ہاتھ ارشاد کی آنکھوں کے اوپر پڑا۔ تمانچوں کے بیچ ارشاد کے منہ سے صرف اتنی آواز نکلی "چاچا"۔ ثاقب بھاگ کر کمرے سے نکل آیا اور دروازے کے باہر کھڑا ہو کر دیکھنے لگا۔ حسین شاہ نے اپنے پنجے کی مٹھی کسی اور ارشاد کے منہ کے بیچ میں ہتھوڑے کی طرح مکا مارا جس کے زور سے

حسین شاہ کے دوسرے ہاتھ سے ارشاد کے بال چھوٹ گئے اور وہ دھڑاک سے دیوار کے ساتھ جا گرا۔ میری لپک کر حسین شاہ کے سامنے آ کھڑی ہوئی "حسین شاہ" چیخ کر بولی، "ہوش میں آؤ کیا کر رہے ہو؟" حسین شاہ نے اتنے زور سے اُسے سامنے سے ہٹایا کہ وہ لڑکھڑاتی ہوئی بستر پر جا گری۔ "تمہارے بھائی کا بیٹا ہے،" میری وہاں سے چیخ کر بولی۔ "تم اسے مار دو گے۔ مار دو گے؟"

حسین شاہ کمرے کے بیچ میں بازو لٹکائے، ٹانگیں مضبوطی سے پھیلائے ساکن کھڑا تھا۔ جیسے کوئی پتھر کا بت ہو۔ صرف اس کا چکلا سینہ سانس کی وجہ سے اوپر نیچے حرکت کر رہا تھا۔ اس کی سکڑی ہوئی آنکھیں ارشاد پر ٹکی تھیں۔ مگر دن کی روشنی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ کمرے کے اندر ایسے دکھائی دیتا تھا جیسے حسین شاہ کے شانے اور بازو اور موٹی موٹی ٹانگیں پھیلتی ہوئی دیواروں سے جا لگی ہوں اور اس کا جسم کمرے کے رقبے پر حاوی ہو گیا ہو۔ ارشاد مضبوط جسم کا جوان تھا۔ اس کا فراغت سے پلا ہوا بدن ملائم اور سڈول اور لچک دار تھا۔ جب وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا آتا تھا تو معلوم ہوتا تھا ہوا میں کلکاریاں بھر رہا ہے۔ مگر اس وقت وہ فرش پر گھٹنے ٹیکے ہوئے حسین شاہ کے سامنے ایک مہمل جان بچے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ حسین شاہ کی پچاس سالہ محنت اس کے پٹھوں میں لوہے کے رسّیوں کی طرح بٹی ہوئی تھی اور اس کی بوڑھی ہڈیوں سے جذبہ اور جوش بجلی کی طرح نکل رہا تھا۔ ارشاد کا منہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اس کا ایک ٹوٹا ہوا دانت اس کی ہتھیلی پر پڑا تھا۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے اور خون ٹھوڑی پر بہہ بہہ کر قمیص کو تر کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہراس تھا۔ جب حسین شاہ نے اس کی جانب قدم بڑھایا تو ارشاد کے چہرے پر موت میں گھرے ہوئے جانور کا سا خوف اُبھر آیا۔

وہ زمین پر بیٹھا بیٹھا چیخا: "چا چا، میں تم کو اندر کرا دوں گا۔ تم غیر قانونی ہو۔ سب کو اندر کرا دوں گا۔"

حسین شاہ پر کوئی اثر نہ ہوا جیسے ارشاد کی آواز اس کے کان تک نہ پہنچی ہو۔ اس نے جھک کر دونوں ہاتھوں سے ارشاد کو اس طرح زمین سے اٹھا لیا جیسے وہ کوئی روئی کی گانٹھ ہو۔ میری کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ حسین شاہ نے ارشاد کو سر سے اوپر اٹھا کر ایک گیند کی طرح اسے دروازے سے باہر پھینک دیا۔ وہ ہمارے قریب اس طرح آ کر گرا جیسے کوئی بھاری چٹان گرتی ہے۔ دھماکے سے سارے کا سارا گھر لرزنے لگا۔ کمرے کے اندر اب حسین شاہ اسی طرح بازو لٹکائے میری کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا سینہ تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ ہم نے سوچا اب وہ میری کو اٹھا کر پٹخنے لگا ہے مگر وہ اسی طرح بازو لٹکائے میری کے سامنے کھڑا رہا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سینے کی حرکت رک گئی۔ اور اس کا غصہ اندر ہی اندر گویا جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے پلٹ کر کھٹاک سے دروازہ بند کر لیا باہر ہم سب گھر کے لوگ سیڑھیوں پر جمع تھے۔ گھر کے اندر خاموشی تھی۔ صرف بچہ شور سے جاگ پڑا تھا اور آہستہ آہستہ رو رہا تھا۔ کئی منٹ اسی طرح گزر گئے کمرے سے اور کوئی آواز نہ آئی۔ پھر میں نے اور ثاقب نے ارشاد کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے زمین سے اٹھایا۔ ارشاد نے ٹوٹنی سے دو چار کلیاں کیں، ہاتھ منہ دھویا اور کمرے میں آ کر اپنے گدے پر بیٹھ گیا۔ گھر کے سب باقی لوگ ایک ایک کر کے ہمارے کمرے میں آ گئے اور ادھر ادھر گدوں پر بیٹھ گئے کسی نے کوئی بات نہ کی۔ کچھ دیر کے بعد ارشاد اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے قمیص اتار کر کونے میں پھینکی اور دوسری قمیص پہن کر کام پر چلا گیا اور کوئی ہمارے کمرے سے نہ اٹھا۔ سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔

آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہوگئیں۔ اس واقعے کا ذکر کسی نے نہ کیا، مگر بیچ بیچ میں ہم اسے یاد کرکے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور پشیمانی سے سر جھکاتے۔ ہمارے دلوں پر ایک ہی خیال نے قبضہ جما رکھا تھا کہ یہ جھگڑا ہم سب کے لیے مصیبت کا باعث بنے گا۔ اس گھر میں صرف ارشاد قانونی تھا اگر وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیتا تو ہمارے اوپر زمین تنگ ہوجاتی۔ یہ عجیب بات تھی کہ ہماری ساری امیدیں اب پھر میری سے وابستہ ہوگئی تھیں۔ ہم اسی کو اس جھگڑے کا بنیاد سمجھتے تھے، مگر ساتھ ہی ساتھ ہمارے دل میں یہ احساس تھا کہ اگر کوئی اس معاملے کو سلجھا سکتا تھا تو وہ میری کی ذات ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں اسی رات کو مل گیا۔ ایک گھنٹے کے بعد حسین شاہ کے کمرے کا دروازہ کھلا اور میری اندر سے نکل کر حسین شاہ کا کھانا تیار کرنے لگی۔ وہ چولھے کے سامنے کھڑی تھی کہ حسین شاہ اندر سے نکل کر ٹائلٹ کو گیا۔ شیر باز نے ایک نظر ہم پر ڈالی۔ اور اٹھ کر دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ جب حسین شاہ ٹائلٹ سے نکل کر آیا تو شیر باز نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ حسین شاہ رک گیا۔ شیر باز اُسے ہمارے کمرے میں لے آیا۔ حسین شاہ ایک طرف ہو کر ہمارے گدّے پر بیٹھ گیا۔

"جو کچھ ہوا سو ہوا"، شیر باز اُسے سمجھانے لگا، "اس بات کو اب فراموش کر دو۔ ارشاد ابھی بچّہ ہے۔ تمھارا اپنا خون ہے۔ تم تو باعقل آدمی ہو۔ اتفاق میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ اگر اتفاق نہ ہوتا تو بتاؤ آج ہمارے پیغمبر کا نام لینے والا دنیا میں کوئی ہوتا۔ اتفاق میں ہی سب کی بھلائی ہے"۔

حسین شاہ سر جھکائے بیٹھا خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولا، مگر اس کی پشیمانی دیکھ کر ہمارے دل کو تسلی ہوگئی۔ جب میری نے

باہر سے کھردری آواز میں اُسے بُلایا: "حسین آکر کھانا کھالو۔" اور میری کی آواز پر حسین شاہ اٹھ کھڑا ہوا اور ہمارے کمرے سے نکل گیا تو ہمیں پورا اطمینان ہوگیا۔ کھانے کے بعد میری نے باہر نکل کر برتن دھوئے۔ ہم اس وقت اپنا کھانا تیار کر رہے تھے۔ غلام محمد کام سے واپس آچکا تھا اور ہم اس کو شام کا واقعہ سنانے کے بعد تسلی دے چکے تھے۔ کمرے کے اندر حسین شاہ بچے کو گود میں لیے کرسی پر بیٹھا تھا۔ میری برتن دھوتی ہوئی ہنس ہنس کر ثاقب سے باتیں کر رہی تھی۔ اس رات کو جب ہم بتیاں بجھا کر سوئے تو یقین نہیں آتا تھا کہ صرف تین گھنٹے پیشتر اس گھر سے ایک طوفان گزر چکا تھا۔

اگلے چند ہفتوں میں ہمارے دلوں سے رہا سہا خدشہ بھی نکل گیا۔ ارشاد فرماں بردار نکلا۔ اس نے اپنے چچا کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا۔ ثاقب کی زبانی معلوم ہوا کہ اس نے اپنے چچا سے معافی مانگ لی ہے۔ اور حسین شاہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا ہے۔ معاملہ صلح صفائی کے ساتھ طے ہوگیا۔ حسین شاہ نے پب جانے میں صرف ایک ہفتے کا ناغہ کیا۔ اس شام کے واقعے کے بعد جو ہفتے کا دن آیا اس دن صرف میری، ارشاد اور ثاقب پب گئے۔ مگر اس سے اگلے ہفتے تک گھر کا سلسلہ پہلے کی طرح آرام سے چلنے لگا۔ ارشاد رات کو اور حسین شاہ دن کے وقت کام پر جاتا اور کوئی کسی کی راہ کا روڑا نہ بنتا چنانچہ ایک بار پھر چاروں نے اکٹھے پب کو جانا شروع کر دیا۔ ارشاد نے پیسے دینے میں کبھی ناغہ نہ کیا۔ بلکہ ثاقب کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ اب ارشاد نے اپنے چچا کو راضی کرنے کے لیے پہلے سے چند پونڈ زائد دینے شروع کر دیے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مگر حسین شاہ بظاہر خوش بہ خوش معلوم ہوتا تھا۔

یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا اگر میری اپنے پاؤں زیادہ پھیلانے شروع

نہ کر دیتی۔ میری کو اب مکمل کنٹرول حاصل تھا۔ اس کو کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ مگر بزرگوں کا قول سچ ہے۔ عورت کبھی اپنی خصلت پر آنے سے نہیں ٹلتی۔ ثاقب کے ساتھ میری کی شروع سے ہی بہت بنتی تھی۔ مگر معاملہ اس سے آگے کبھی نہیں بڑھا۔ اب ایک بار حسین شاہ اور ارشاد کا مسئلہ حل ہو گیا اور زندگی بخیر و خوبی گزرنے لگی تو میری نے ثاقب کی طرف رجحان کرنا شروع کر دیا۔ ثاقب نو عمر اور معصوم طبیعت کا لڑکا تھا سب اس کے ساتھ اپنے بچوں کا سا سلوک کرتے تھے۔ شروع سے کبھی کسی نے میری کے ساتھ اس کے تعلقات کو قابل غور نہ سمجھا تھا۔ مگر جب ان کا دروازہ بند ہونا شروع ہوا تو ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ ثاقب پانچ بجے کام سے واپس آجاتا تھا۔ اس وقت ارشاد کسی وجہ سے باہر جاتا یا دوسرا منزل پر بیٹھا ہوتا تو موقع دیکھ کر میری ثاقب کو کمرے میں بلا لیتی اور دروازہ بند کر لیتی۔ کئی دنوں تک یہ بات حسین شاہ اور ارشاد سے چھپی رہی۔ مگر ایک ہی گھر کے اندر کتنے روز تک چلتی۔ پہلے ارشاد کو علم ہوا، پھر حسین شاہ کے کانوں تک بات پہنچی۔ حسین شاہ تو چپ رہا، البتہ ارشاد نے میری سے تھوڑی بہت تکرار کی۔ مگر میری کو کس کی پروا تھی۔ اس نے ارشاد کو چپ کرا دیا۔ ثاقب کے طور میں بھی فرق آنے لگا۔ پہلے جو میری کے ساتھ اس کی گفتگو ہوتی تھی اس کی ایک ایک بات ہمیں آکر بتایا کرتا تھا۔ اب اس نے ہم سے کچھ راز داری برتنی شروع کر دی تھی۔ ہمارے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بھی اس نے کم کر دیا، گو کھانا وانا ہمارے ساتھ ہی کرتا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میری کے نزدیک ہو کر وہ ہر ایک سے کٹتا جا رہا ہے۔ ثاقب کی انگریزی ہم سب سے اعلیٰ تھی، اور وہ اس بات پر بجا فخر کرتا تھا۔ میری کے ساتھ اس کا رشتہ کسی حد تک ثاقب کی انگریزی بول چال پر ہی استوار ہوا تھا۔ اب ثاقب نے اپنے ادبی رسالے چھوڑ کر انگریزی کے رسالے پڑھنے شروع کر دیے تھے۔ وہ ہر وقت میری کے پاس

کھڑا اس کے ساتھ لمبی لمبی انگریزی بولتا رہتا تھا اور رسالوں میں سے مختلف حصے پڑھ کر اسے سنایا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ہمارے ساتھ بھی باتیں کرتے کرتے انگریزی بولنے لگتا تھا۔ ہوتے ہوتے میری کایہ دستور بن گیا۔ دیدہ دلیر تو وہ ہو چکی تھی، یہ پروا بھی نہ کرتی کہ ارشاد کمرے کے باہر پھر رہا ہے یا حسین شاہ گھر میں موجود ہے۔ جب اس کا جی چاہتا تو اندر کو بلا کر دروازہ بند کر لیتی، اور جب تک جی چاہتا بند رکھتی۔ نہ ارشاد نہ حسین شاہ دروازہ کھلوانے کی کوشش کرتے، بلکہ ایسے موقعے پر گھر میں ادھر ادھر اپنے کام کرتے پھرتے، اور جب دروازہ کھلتا تو روزمرہ کی طرح اندر چلے جاتے۔ ظاہری طور پر دیکھا جائے تو واقعات ہماری منشا کے مطابق ہوتے جا رہے تھے۔ سب اپنی اپنی جگہ پر خوش تھے۔ اور گھر کے سلسلے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو رہی تھی۔ مگر دراصل صورتِ حال ایسی نہ تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ جب جھگڑے ہوا کرتے تھے تو ہمارے دل کو کبھی ایسی تشویش لاحق نہ ہوتی تھی جیسی اب ہوتی جا رہی تھی جب کہ سب کام صلح صفائی سے ساتھ انجام پا رہے تھے۔ مگر صلح کیسی اور صفائی کہاں کی! یہ تو زندگی کے تانے بانے کی بات ہے۔ اگر دو تانے آپس میں الجھ جائیں تو گانٹھ کو کھولا جا سکتا ہے لیکن ان کے سرے ہی ادھر ادھر سے چھوٹنے لگیں تو سارے کا سارا بانا ادھڑنا شروع ہو جاتا ہے اس کے بعد صرف وقت کی بات رہ جاتی ہے۔ جلد یا بدیر یہ سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ہم اپنے آپ کو تسلی دینے کی خاطر اس بات کو نظروں سے چھپائے پھرتے تھے۔ مگر ہمارے سامنے اس کی بُنتر کا ایک ایک تار گرتا جا رہا تھا۔ ہمارے دلوں میں یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا کہ جیسے ہم کسی دریا کے کنارے کھڑے ہیں اور ایک نہ ایک دن زمین ہمارے پیروں کے نیچے سے سرک جائے

گی۔

ثاقب کے اندر حیرت انگیز تبدیلی واقع ہو رہی تھی۔ میری کا کمرہ اور اٹک اس کے دو ٹھکانے رہ گئے تھے۔ ہمارے ساتھ وہ صرف کھانا کھانے کے لیے بیٹھتا، کوئی ایک آدھ بات کرتا اور اٹھ جاتا۔ اس نے کام سے ناغہ کرنے شروع کر دیے تھے۔ کبھی بیماری کی چھٹی لے لیتا، کبھی غیر حاضر ہو جاتا، اور کبھی کام جلدی چھوڑ کر واپس آ جاتا۔ میری کی میں ایک تعریف کروں گا۔ وہ ثاقب کو کام کا ناغہ کرنے سے منع کیا کرتی تھی، اس سے کہتی، "ثاقب، یہ ملک کام کے بل بوتے پر چلتا ہے۔ اس ملک میں اور کچھ نہیں رکھا۔ کام نہیں کرو گے تو تمھیں کوئی نہیں پوچھے گا۔" لیکن ثاقب کے واسطے میری سے اوجھل رہنا وقت طلب ہوتا جا رہا تھا۔ اٹک میں ہوتا تو منہ اٹک کی موری پر رکھ کر گدے پر لیٹا ہوتا اور اس کی آنکھیں میری کے دروازے پر لگی رہتیں۔ اٹک سے باہر ہوتا تو پرچھائیں کی طرح میری کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا اور آنکھیں پھر بھی میری کے اوپر سے نہ ہٹتیں، جیسے کوئی سودائی ہو۔ ان چاروں نے اکٹھے پب کو جانا بھی بند کر دیا تھا۔ ارشاد کے دل میں بغض تھا چنانچہ ایک دن پب سے واپسی پر اس نے ثاقب سے کسی بات پر جھگڑا کر لیا اور اس پر پل پڑا۔ میری اور حسین شاہ نے دونوں کو علیحدہ کرا لڑ تو کر دیا مگر اتنی دیر میں ثاقب کو کافی ضربیں آ گئیں۔ اس کے منہ اور ناک سے خون بہنے لگا۔ اس دن سے ثاقب نے ان کے ساتھ جانا چھوڑ دیا۔ پھر کچھ دن کے بعد حسین شاہ اور ارشاد کے درمیان تُو تُو مَیں مَیں ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ پیسوں کی لین دین پر جھگڑا ہوا تھا۔ ارشاد کے پاس پیسے کم بچنے لگے تھے کیونکہ اس نے اب اپنے لیے اور میری کے لیے نئے نئے کپڑے خریدنے شروع کر دیے تھے۔ ایک دو ہفتے تو حسین شاہ چپ رہا، مگر جب

تیسرے ہفتے بھی ارشاد نے اسے کم پیسے دیے تو وہ ارشاد کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ یہ بات ہمارے تک ثاقب کے ذریعے پہنچی تھی۔ جس کا حوالہ حسین شاہ اور میری کی زبان تھی۔ مگر ارشاد نے ہمیں کچھ اور بات بتائی۔ ارشاد نے کہا کہ پیچھے گاؤں میں حسین شاہ نے بہت سی زمین خریدی ہے اور ساری آراضی اپنے اور اپنے بیٹے کے نام لگوائی ہے۔ حالانکہ حسین شاہ نے کہہ رکھا تھا کہ ارشاد کے پیسوں سے جو آراضی آئے گی وہ ارشاد کے نام لگے گی۔ ارشاد نے کہا کہ اگر اس کا بیٹا اس سے میری کے عوض میں پیسے لیتا ہے تو پھر جتنے ہو چکے بہت ہو چکے اب وہ ایک پیسا دینے کا روادار نہیں، اس کا قانونی حق ہے۔ قصہ درحقیقت جو بھی تھا بہر حال ارشاد اور حسین شاہ کا ساتھ چھوٹنے کا باعث بنا۔

اب ان تینوں نے اکیلے اکیلے میری کے ساتھ پب کو جانا شروع کر دیا کسی کا کوئی دن مقرر نہ تھا۔ جب میری کا دل چاہتا کسی ایک کو ساتھ لے کر چلی جاتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری ہفتے میں تین دن اور حسین شاہ اور ارشاد اور ثاقب ایک ایک دن پب کو جانے لگے۔ اب میری نے ثاقب کے کھانے دانے کا بندوبست بھی اپنے ذمے لے لیا تھا۔ ثاقب ہمارے ساتھ صرف کھانے پینے کے لیے بیٹھا کرتا تھا، وہ بھی ختم ہوا۔ اب میری مکمل طور پر ان تینوں کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ کام کی بڑی ماہر تھی، پورے ہفتے کی خریداری خود کرتی، ہر روز ان کا کھانا پکاتی، برتن صاف کرتی، ان کے کپڑے دھوتی، استری کرتی، کمرے کی صفائی کرتی، اور اس کے باوجود اتنا وقت نکال لیتی کہ ہر دوسرے دن شام کو تیار ہو کر کسی ایک کے ساتھ پب کو چلی جاتی۔ حسین شاہ، ارشاد اور ثاقب کی ہر ضرورت پوری ہونے لگی۔ ان کو گھر کے کسی کام کی فکر نہ رہی۔ میری کی شکل شباہت بھی بدل گئی۔ اس کی صحت بہتر

ہوگئی، بدن پر اس کی بوٹی نظر آنے لگی۔ باہر جانے سے پہلے باقاعدہ سنگار کرتی۔ صرف اس کی آنکھوں کے گرد حلقے اسی طرح قائم رہے۔ ان کو چھپانے کے لیے کئی کئی رنگوں کے پوڈر اور مسالے ان پر لگاتی جس سے وہ خوشنما معلوم ہوتے۔ مگر صبح کو اٹھ کر جب ہاتھ منہ دھوتی تو حلقے اسی طرح دکھائی دینے لگتے۔ گھر کے نقشے میں آہستہ آہستہ کئی تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔ جب سے ہماری منزل پر جھگڑے پڑے تھے گھر والوں کا آپس میں اٹھنا بیٹھنا تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ غلام محمد کی زندگی تو سیٹ تھی۔ کام سے واپس آکر کھانا کھاتا اور سو جاتا۔ صرف میں کبھی کبھی کھانے کے بعد اٹھ کر دوسری منزل پر چلا جایا کرتا تھا۔ شیر باز حافظ آبادی ہر دم افسوس کا اظہار کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جب تک معاملہ حسین شاہ اور ارشاد کے بیچ تھا اس وقت تک ٹھیک تھا۔ ان کی آپس کی بات تھی، سنبھال لیتے۔ آخر حسین شاہ کا میری کے اوپر بہت بڑا احسان تھا اور ارشاد کا اس پر قانونی حق تھا۔ مگر ثاقب کی شمولیت تباہی کی جڑ تھی۔ ایک تو غیر تھا، دوسرے بچہ تھا اور ناتجربہ کار۔ تھا، خراب ہوگا۔ ہم سب کو اس بات میں شیر باز کے ساتھ اتفاق تھا۔ پہلی منزل پر رنڈی کی آمد پھر شروع ہو چکی تھی۔ پہلے ایک دو بار کا ہمیں پتا نہ چلا۔ پھر آہستہ آہستہ خبر پھیلتی گئی۔ دوسری منزل سے ابھی دو بنگالی اور ایک حافظ آبادی اس میں شریک ہوئے تھے۔ باقی شمولیت سے باہر تھے، مگر ہمیں احساس تھا کہ اب صرف وقت کی بات رہ گئی ہے جلد یا بدیر سلسلہ جاری ہو جائے گا۔ آخر ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی زندگی گزرتی ہے۔ گھر میں اب وہ بات نہ رہی تھی ہمیں اس بات کا احساس تھا۔ میرا اور غلام محمد کا دل بھی کچا پکا ہو رہا تھا۔ مگر وقت نے ہمیں مہلت نہ دی۔ یہ قسمت کے کھیل ہیں۔ بسا بسایا گھر ایک روز اجڑنا تھا۔ اُجڑ گیا۔ آخر وہ دن بھی آپہنچا۔

اتنا بڑا واقعہ جس نے بم کے دھماکے کی طرح اچھال کر گھر کے گھر کو تتر بتر کر دیا، ایک منٹ کے اندر تمام ہو گیا۔ اب سوچتا ہوں تو یقین نہیں آتا۔ میرا کمرہ ان کے ساتھ لگتا تھا اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔ میں اسی وقت کام سے واپس آیا تھا اور کمر سیدھی کرنے کو گدے پر لیٹا ہوا تھا۔ میری کے کمرے سے آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر یہ روزمرہ کی بات تھی، میں نے کوئی غور نہ کیا۔ اچانک کسی کے تیز تیز بولنے کی آواز آنے لگی۔ میں نے کان لگا کر سنا تو حسین شاہ کی آواز تھی۔ وہ سخت غصے کی حالت میں گالیاں دے رہا تھا۔ پھر آواز ایک دم بند ہو گئی۔ اس کے فوراً بعد کسی نے لمبی سی "ہائے" کی۔ کسی کے دھڑام سے زمین پر گرنے کی آواز آئی۔ پھر ایک اور آواز۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دو چار عجیب سی آوازیں ایک دم بلند ہوئیں اور ختم ہو گئیں۔ اس کے بعد گویا ایک کہرام مچ گیا۔ میری چیخوں پر چیخیں مارنے لگی۔

نیچے سے لوگ بھاگتے ہوئے اوپر چڑھ آئے۔ میں نے دھکا دے کر میری کے کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر ایک ہیبت ناک منظر تھا۔ حسین شاہ چاروں شانے چت زمین پر ایسے پڑا تھا جیسے سرد ہو چکا ہو۔ اس کی آدھی قمیص بائیں بغل سے لے کر پتلون کی پیٹی تک، خون سے تر تھی۔ اور سیاہ نظر آ رہی تھی۔ ارشاد دیوار سے ٹیک لگائے اور گھٹنے اٹھائے ہوئے بیٹھا تھا مگر بے حس و حرکت دکھائی دیتا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ زمین پر الٹا پڑا تھا اور دوسرا سینہ پکڑے ہوئے تھا جس کی انگلیوں کی بیچ سے خون ابل ابل کر نکل رہا تھا۔ خون اتنا متحرک اور جان دار تھا کہ مجھے یاد ہے اسے دیکھ کر مجھے ایک لمحے کے لیے حیرت ہوئی تھی کہ ارشاد اتنا بے جان کیوں دکھائی دے رہا ہے۔ اس کا سر چھاتی کے اوپر ڈھلکا ہوا تھا۔ ثاقب ان دونوں کے درمیان کھڑا تھا اس کے ہاتھ

میں میری کی گوشت کاٹنے والی چھری پکڑی ہوئی تھی جس سے خون ٹپک رہا تھا۔ ثاقب دونوں گھائل آدمیوں کی طرف دیکھ رہا تھا، مگر اس کی آنکھوں میں پہچان نہ تھی۔ میری اپنے بچے کو سینے سے چمٹائے ایسے چیخ رہی تھی جیسے اب کبھی چپ نہ کرے گی۔ ہم سب دروازے میں کھڑے پھٹی پھٹی نظروں سے اندر کا منظر دیکھتے رہے۔ کسی کی ہمت نہ پڑی کہ داخل ہو کر میری کو چپ کرائے یا ثاقب کے ہاتھ سے چھری پکڑے۔ اچانک ہم میں سے ایک آدمی نکل کر پیچھے کو بھاگا اور دبڑ دبڑ کرتا ہوا سیڑھیاں اتر گیا۔ کسی دوسرے کی آواز آئی۔

"یہاں سے بھاگو۔ پکڑے جاؤ گے۔"

بھاگم دوڑ مچ گئی۔ ہم جو لوگ گھر میں موجود تھے انھیں اپنا سامان اٹھانے کا موقع مل گیا۔ جو گھر میں نہیں تھے وہ باہر ہی باہر سے غائب ہو گئے۔ میں نے کچھ کپڑے اور جوتوں کا ایک جوڑا ٹرنک میں ڈالا۔ نقدی جیب میں رکھی اور ٹرنک اٹھا کر دو منٹ کے اندر اندر گھر سے باہر ہو گیا۔

باہر اندھیرا ہو چکا تھا۔ گھر کا دروازہ بار بار کھل رہا تھا اور بند ہو رہا تھا۔ ہمارے ساتھی ایک ایک کر کے بھاگتے ہوئے گھر چھوڑ رہے تھے۔ میں ابھی تیمری گلی میں چلا جا رہا تھا کہ ایک پولیس کی گاڑی شور مچاتی ہوئی میرے پاس سے گزری۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ دن اور آج کا دن میں نے اس طرف کا رُخ نہیں کیا۔ مگر وہ رخصت کا منظر مجھے آج بھی یاد ہے۔ جب تک میں نے اپنی گلی کو پار نہیں کر لیا، پیچھے مڑ کر دیکھتا رہا۔ دروازہ کھلتا تو اندر سے بجلی کی روشنی پڑتی اور کوئی تیزی سے باہر نکلتا۔ دروازہ بند ہوتا تو اندھیرا ہو جاتا۔ پھر گلی کی مدھم روشنی میں وہ سایہ اِدھر اُدھر کہیں غائب ہو جاتا۔ دو سال

کے پرانے ساتھیوں سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔ ان میں سے کتنے بچ گئے اور کتنے پکڑے گئے، کتنے یہاں پر ہیں اور کتنے نکالے گئے، مجھے کچھ خبر نہیں۔ آج اگر کسی سے میرا سامنا ہو جائے تو شاید پہچان بھی نہ سکوں۔ اتنا عرصہ گزر گیا ہے۔ مگر ایک بات کا مجھے یقین ہے کہ آج وہ بھی مجھے اسی طرح سے یاد کرتے ہوں گے جس طرح میں ان کو کرتا ہوں۔ وہ وقت ہی ایسا تھا۔ گویا ایک جنگ تھی اور ہم اس کے سپاہی تھے۔ کئی جنگ میں کام آتے ہیں، جو بچ جاتے ہیں ان کی زندگی کی رفتار تھم جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد جیسی بھی گزرتی ہے گویا روزمرہ کی بات ہوتی ہے۔

میں کیسے گزتا پڑتا اور جگہ جگہ سر چھپاتا ہوا سکاٹ لینڈ جا نکلا اور وہاں مجھ پہ کیا بیتی، یہ ایک الگ کہانی ہے۔ وہاں پر مجھے ایک چھوٹے سے گم نام کارخانے میں نوکری مل گئی۔ میں نے داڑھی بڑھا لی تاکہ حلیہ کچھ تبدیل ہو جائے۔ اس طرح چھپ چھپا کر دن گزارنے لگا۔ مجھے گلاسکو میں رہتے ہوئے کئی سال ہو گئے تھے کہ ایک روز شہر میں پھرتے ہوئے ایک چھوٹے سے کیفے کے اندر مجھے ایک مانوس شکل دکھائی دی۔ میں رک گیا۔ دروازے کے شیشے میں سے غور سے دیکھا تو مجھے یاد آیا کہ یہ آدمی برمنگھم میں ہمارے ساتھ والے مکان میں رہا کرتا تھا۔ اس کا نام گل محمد تھا۔ وہ ایک میز پر اکیلا بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ میں جا کر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اس طرح میری جانب دیکھا جیسے میں کوئی اجنبی ہوں۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو پھر اس کو گزرا ہوا زمانہ یاد آ گیا۔ وہ بھی کچھ عرصے سے گلاسکو میں رہ رہا تھا۔ ہم پرانی باتیں کرنے لگے۔ گل محمد سے مجھے سارے حالات کا پتا چلا۔ اس نے بتایا کہ جب واردات ہوئی تھی اس وقت وہ اپنے گھر میں موجود تھا۔ اس نے پولیس کو آتے

ہوتے دیکھا۔ سب لوگ گھر سے بھاگ چکے تھے سوائے بنگالیوں کے۔ بنگالی بھی دروازے تک پہنچ چکے تھے جب پولیس آگئی۔ دونوں بنگالی پکڑ لیے گئے۔ رات تک وہاں پر مجمع لگا رہا۔ ثاقب کو حراست میں لے لیا گیا۔ مالک مکان بھی وہاں پہنچ گیا۔ ہر طرف سے پولیس کی کاریں وہاں آتی اور جاتی رہیں۔ آخر کئی گھنٹے کی کارروائی کے بعد پولیس والے ثاقب کو ایک کار میں، میری کو دوسری میں اور بنگالیوں کو تیسری کار میں بٹھا کر لے گئے۔ مردہ خانے کی ایک ایمبولنس گاڑی دونوں لاشوں کو اٹھا کر لے گئی۔ مکان کو تالا لگا دیا گیا۔ مگر کئی دن تک وہاں ایک سپاہی کا پہرہ لگا رہا اور پولیس افسر گھر کے اندر آتے جاتے رہے۔ پھر پہرہ ہٹا لیا گیا۔ مگر مکان بند پڑا رہا۔ اس کے بعد جتنا عرصہ گل محمد وہاں رہتا رہا وہ گھر آباد نہ ہوا۔ محلے کے بچوں نے پتھر مار مار کر اس کی کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیے۔ ان کے راستے پرندوں نے اندر داخل ہو کر گھونسلے بنا لیے اور بلیاں ان کی تاک میں پھلانگ پھلانگ کر اندر باہر آتی جاتی رہتیں۔ مالک مکان نے کبھی اس کی خبر نہ لی۔ مکان کھڑا کا کھڑا ویران ہو گیا۔ ایک سال کے بعد گل محمد اس شہر سے کوچ کر آیا۔ مگر مقدمے کی کارروائی ان دنوں خوب مشہور ہوئی اور سب اخباروں میں چھپتی رہی۔ گل محمد نے بتایا کہ وہ اسی خبر کو پڑھنے کے لیے اخبار خریدا کرتا تھا اور اسے ساری کارروائی کا علم تھا۔ اس نے بتایا کہ دونوں بنگالیوں نے پولیس کی طرف سے وعدہ معافی ملنے پر اس گھر میں رہنے والے ایک ایک آدمی کا نام، پتا اور اس ملک کے اندر ان کے رشتہ داروں، عزیزوں اور ملنے والوں کے نام پتے وغیرہ درج کروا دیے تھے۔ اس کے بدلے میں ان کو چھ مہینے تک کا ویزا لگوا دیا گیا تاکہ وہ کام وغیرہ کا ثبوت مہیا کر کے مستقل طور پر بسنے کی کارروائی شروع کر سکیں۔ اس طرح ہم سب کے نام

پولیس ریکارڈ میں چلے گئے۔ میری کی گواہی بھی ہوئی اس نے صاف صاف اگلے پچھلے سارے حالات بیان کر دیے۔ البتہ اس نے ثاقب کو مجرم نہ ٹھہرایا۔ مگر ثاقب نے عدالت کے سامنے اقبالِ جرم کر لیا۔ اس پر عدالت نے اس کا دماغی معائنہ کروانے کا حکم دے دیا۔ دماغی معائنے کی رپورٹ کے مطابق ثاقب کا دماغ ہل گیا ہوا تھا۔ چنانچہ یہاں کے قانون کے مطابق عدالت نے ثاقب کو ایک ڈاکری جیل میں بھیج دیا۔ یہ جگہ صرف ان ملکوں میں میں نے دیکھی ہے۔ یہ جیل خانہ بھی ہوتا ہے اور ہسپتال بھی، اور یہاں صرف دماغی مجرم رکھے جاتے ہیں۔ گل محمد کو کسی سے پتا چلا تھا کہ ثاقب کو لندن کے قریب ایک ایسی ہی ڈاکری جیل میں رکھا گیا ہے۔ میں نے گل محمد سے پوچھ کر اس جگہ کا نام ایک کاغذ کے پرزے پر لکھا اور بٹوے میں ڈال لیا۔ گل محمد اور میں دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ مگر گلاسگو بہت بڑا شہر ہے، سالوں سال ایک محلے سے دوسرے کا گزر نہیں ہوتا۔ گل محمد سے اس دن کے بعد میری ملاقات نہیں ہوئی۔

زندگی کی اچھائیاں اور برائیاں آدمی کے ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ اپنے ہی ایک آدمی نے دشمنی میں آکر میری مخبری کر دی اور میں پکڑ لیا گیا۔ تین مہینے تک میں نے جیل کاٹی اور مقدمہ لڑتا رہا۔ آخر سرخرو ہوا۔ کچھ قدرت نے بھی میری مدد کی۔ اس ملک کا قانون بدل گیا اور ہم لوگوں کو یہاں پر بس جانے کی آزادی مل گئی۔ میرے پاس جو تھوڑی پونجی تھی سب خرچ ہو گئی۔ لیکن ہم لوگ جو بے وطنی میں آکر زندگی بسر کرتے ہیں ہمت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ مجھ سے جتنی جلدی ہو سکا اسکاٹ لینڈ سے نکل آیا۔ وہاں کی سردی نے میری جان عذاب میں ڈال رکھی تھی۔ آخر پھرتا پھراتا میں لندن کے قریب اس چھوٹے

سے شہر میں آپہنچا۔ یہ بڑا پُر فضا مقام ہے۔ سمندر کے کنارے پر ہے۔ اور لوگ یہاں پر گرمیوں کی چھٹیوں میں سیر تفریح کے لیے آتے ہیں۔ یہاں پر مجھ کو پوسٹ آفس میں ڈاکیے کی ملازمت مل گئی۔ نوکری سخت ہے مگر پکی ہے اور ٹائم مل ملا کر تنخواہ اچھی بن جاتی ہے۔ دن رات محنت کر کے میں نے ایک سال کے اندر یہاں اپنا مکان خرید لیا اور بیوی بچوں کو ادھر منگوانے کا بندوبست شروع کر دیا۔ ایک روز چھٹی کے دن میں اکیلا گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے اچانک ثاقب کی یاد آئی۔ میں نے بٹوہ کھول کر دیکھا۔ بٹوے کے ایک کونے میں ابھی تک کاغذ کا وہ پُرزہ موجود تھا جس پر میں نے گل محمد سے پوچھ کر ثاقب کے جیل خانے کا پتا لکھا تھا۔ وہ جگہ اس شہر سے زیادہ دور واقع نہیں ہے۔ میں نے اسی وقت ثاقب کو جا کر ملنے کا ارادہ کر لیا۔ پندرہ دن کے بعد جب دوبارہ میری چھٹی کا دن آیا تو میں نے صبح سویرے گھر کے کام ختم کیے اور بس پر سوار ہو کر چل نکلا۔

اس ڈاکٹری جیل کی بہت بڑی عمارت تھی جس کے گرد نیچی سی فصیل بنی ہوئی تھی۔ جب میں نے دروازے پر پہنچ کر اپنا مدعا بیان کیا تو اس وقت مجھے پتا چلا کہ ثاقب سے ملنا اتنا آسان کام نہیں جتنا کہ میں نے سمجھ رکھا تھا۔ دربان مجھے اپنے ساتھ ایک چھوٹے سے دفتر میں لے گیا۔ وہاں پر میں کافی دیر تک بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ پھر اندر سے ایک افسر نکل کر آیا اور میرا نام پکار کر مجھے اپنے پیچھے پیچھے ایک دوسرے دفتر میں لے گیا۔ وہاں پر اس نے لمبی چوڑی پوچھ گچھ شروع کر دی۔ میں کون ہوں، کیا مجھ کو ثاقب کی حالت کا علم ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے صاف صاف ساری باتوں کے جواب دے دیے اور ساتھ ہی اپنے کاغذات بھی دکھا دیے جن پر درج تھا کہ اب میں قانونی طور پر آزاد ہوں اور سرکاری ملازمت کرتا ہوں۔ اس افسر نے شریفانہ طور پر مجھ سے کہا کہ یہ ساری

کار روائی ضروری ہے اور امید ہے کہ میں اس کا بر انہیں منواؤں گا۔ بعد میں جب وہ ساری تفتیش مکمل کر چکا تو کہنے لگا، "ہم بہت خوش ہیں کہ تم ثاقب سے ملنے کے لیے آئے ہو۔ آج تک اس کا کوئی واقف کار اس سے ملنے نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے تمہارے ساتھ ملاقات کرنے کا ثاقب پر بہت اچھا اثر پڑے۔" اس کے بعد اس نے کہا کہ اب میں جا سکتا ہوں۔ مجھے چند دنوں تک خط کے ذریعے اطلاع دے دی جائے گی۔ میں اس کا شکریہ ادا کر کے چلا آیا۔ ایک مہینہ گزر گیا اور کوئی اطلاع نہ آئی۔ میں اس بارے میں تقریباً مایوس ہو چکا تھا کہ ایک روز اچانک ان کا خط آ پہنچا۔ اس میں لکھا تھا کہ ثاقب کے ساتھ ملاقات کے لیے میرا نام منظور ہو گیا ہے، اور میں فلاں فلاں یا فلاں تاریخ کو اتنے بجے آ کر اس سے ایک گھنٹے کی ملاقات کر سکتا ہوں۔ مگر جس دن آنا چاہوں اس کی اطلاع پہلے خط کے ذریعے پہنچا دوں۔ یہ اشد ضروری ہے۔ نیچے جیل کے گورنر کے دستخط تھے۔ ان تین تاریخوں میں سے ایک پر میری چھٹی آتی تھی۔ چنانچہ میں نے خط کے ذریعے ان کو اطلاع دے دی کہ میں فلاں دن کو صبح گیارہ بجے ملاقات کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔ خط ڈاک کے حوالے کر کے میں اس دن کا انتظار کرنے لگا۔

سنا ہے کہ جیل خانوں میں ملاقات سلاخوں کے آر پار ہوتی ہے۔ مگر یہ جیل مختلف تھی۔ مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا گیا۔ جہاں قالین بچھا تھا اور صوفے پڑے تھے، جیسے کسی گھر کی بیٹھک ہو۔ وہاں پر میں چار پانچ منٹ تک اکیلا بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ اس کے بعد دروازہ کھلا اور ثاقب ایک اور شخص کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں داخل ہو کر وہ شخص ثاقب سے بولا:

"ثاقب۔ یہ تمہارا دوست ہے۔ تم سے ملنے آیا ہے۔"

ثاقب نے سر ہلا کر اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ میں نے ثاقب سے ہاتھ ملایا۔

وہ شخص پھر بولا: "ثاقب ٹھیک ہے؟ اب میں جاؤں؟"

ثاقب نے سر ہلا کر جواب دیا: "ہاں۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ آدمی بولا۔ "اب میں جاتا ہوں۔ تم یہاں بیٹھ کر اپنے دوست سے باتیں کرو۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ جاتے دفعہ اس نے دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔

ثاقب کو میں نے کئی سال کے بعد دیکھا تھا۔ اس کا حلیہ بدل چکا تھا۔ اس نے کوٹ پتلون پہنا ہوا تھا اور گلے میں ٹائی لگا رکھی تھی۔ اس کے بوٹ پالش سے چمک رہے تھے اور بالوں میں تیل ڈال کر کنگھی کی ہوئی تھی۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے وہ کہیں جانے کے لیے تیار ہو کر آیا ہے۔ وہ بہت موٹا ہو گیا تھا۔ اس کی عمر اس وقت چھبیس ستائیس سے زیادہ کی نہ ہو گی مگر دیکھنے میں وہ اپنی عمر سے بہت بڑا لگنے لگا تھا۔ گوشت بڑھ جانے کی وجہ سے اس کے چہرے پر پختگی آ گئی تھی۔

"ثاقب!" میں نے کہا۔ "مجھے پہچانا؟"

"ہاں۔" ثاقب نے سر ہلا کر جواب دیا۔ مگر اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں پہچان پیدا نہ ہوئی۔

"کیا حال چال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اب ٹھیک ہوں۔" وہ خوش ہو کر بولا۔ وہ انگریزی بولے جا رہا تھا۔ اس کی زبان بدل گئی تھی۔ میں بھی انگریزی میں بات چیت کرنے لگا۔

"کیا کر رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم فٹ بال کا میچ دیکھ رہے تھے۔"

"میچ دیکھ رہے تھے؟"

"ہاں!" وہ بولا۔ "ہمارے پاس کلر ٹیلی ویژن ہے۔"

"رسالے پڑھتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں!" ثاقب نے جواب دیا۔ "کارپینٹری میں کام کرتا ہوں۔"

"اچھا؟ کیا بناتے ہو؟"

"سب چیزیں۔" ثاقب نے کہا۔ "میز کرسیاں۔"

ہماری گفتگو ختم ہو گئی۔ ہم کافی دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ ثاقب میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی ہی بے مدعا سی کیفیت تھی۔ ایک جگہ پر ٹھہری رہتی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ ثاقب سے پرانے زمانے کی باتیں کروں، شاید اس کی پہچان کچھ ابھرے۔ مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔ آخر میں دل مضبوط کر کے کہا۔

"ثاقب برمنگھم یاد ہے؟"

وہ خوشی سے سر ہلا کر بولا: "ہاں!" اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد اچانک بولا۔ "ہم لندن گئے تھے۔"

"لندن کیا کرنے گئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"بس میں بیٹھ کر گئے تھے۔" ثاقب نے کہا۔ "سیر کرنے کے لیے۔" اس نے پھر بات ختم کر دی اور میری طرف دیکھنے لگا۔

میرے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ ایک طرف تو میرا جی نہ چاہتا تھا کہ ثاقب کو وہ ناخوش گوار باتیں دلاؤں۔ دوسری طرف زبردست خواہش تھی کہ کوئی ایسی بات کروں جس سے اس کے چہرے کا پتھر ٹوٹے۔ اسے دیکھ دیکھ کر میرا دل گھبرانے لگا تھا۔

"ثاقب!" میں نے کہا۔ "تمھیں میری یاد ہے؟"

میری کا نام لے کر میں نے غور سے ثاقب کے چہرے پر اداس

کی آنکھوں میں دیکھا۔ مگر ثاقب کے چہرے پر رنگ تک نہ آیا، گویا میری بات کا جواب اس نے فوراً دیا۔

"ہاں۔" اس نے کہا۔ وہ کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کی نظر دیوار پر لگی ہوئی ایک تصویر سے گزری جس میں چند مزدور ننگے بدن کھدائی کا کام کر رہے تھے۔

"لنچ کے بعد ریسٹنگ ہوگی۔" ثاقب نے کہا۔

"کہاں؟"

"ٹیلی ویژن پر۔" وہ خوشی سے بولا۔ "آج لنچ میں فش ہے۔"

جب ہمارا وقت ختم ہو گیا تو وہ آدمی، جو پہلے ثاقب کے ہمراہ آیا تھا، دوبارہ کمرے میں داخل ہوا۔ میں اپنی کرسی سے اٹھا تو ثاقب جلدی سے ہاتھ بڑھا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کل پھر آؤ گے؟" وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر بولا۔

"کل نہیں۔" میں نے کہا۔ "کچھ دیر کے بعد آؤں گا۔"

"اچھا۔" ثاقب خوشی سے بولا۔ "اچھا۔"

واپسی پر میں وہاں سے دوسری بس پر سوار ہوا۔ بڑا خوش گوار دن تھا۔ آسمان پر بادل کا نشان نہ تھا۔ تیز دھوپ ہر طرف سرسبز میدانوں پر اور نیلی سڑکوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ ایسے چمک دار دن اس ملک میں کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں، اور جب آتے ہیں تو ان کا نقشہ دل پر ثبت ہو جاتا ہے۔ میں دل کا ہلکا نہیں ہوں۔ مگر میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں بس میں بیٹھا بیٹھا رونے لگوں۔ ثاقب کی دنیا ہر طرف سے بند ہو گئی تھی۔ وہ اس دنیا میں اللہ تھلک رہ رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر وہ وقت یاد آ رہا تھا۔ جب وہ نیا نیا یہاں آیا تھا اور ہمارے ساتھ اس مکان میں رہا کرتا تھا۔ اتنا پھرتیلا، اتنا البیلا، اتنا علاد ماغ۔ لکھائی پڑھائی کا شوقین